ان کے ساتھ نہیں ہیں، لیکن زمامِ کار اس وقت انہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انگریزی اقتدار کے دور میں آگے بڑھنے کے جتنے مواقع بھی ملے زیادہ تر انہی کو ملے اور جاتے وقت انگریز نے اپنی میراث بھی اپنے اس خلف الصدق گروہ کو سونپی۔

دوسرا مدرسۂ فکر وہ ہے جو اسلام کی اندرونی قوتِ حیات کے نتیجے میں ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں جن کے درمیان جزئیات و فروع اور مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہیں، مگر قدرِ مشترک ان سب کے درمیان یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کو اپنے لئے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں اور تمام معاملاتِ زندگی میں اس ہدایت کو حجت مانتے ہیں جو خدا و رسول سے ثابت ہو۔ یہ مدرسۂ فکر انگریزی اقتدار کے پورے دور میں مغلوب و مقہور رہا، نشوونما کے ذرائع سے محروم رہا، ہر شعبۂ زندگی میں زمامِ کار سے بے دخل رہا، اور اب بھی کم و بیش اس کا یہی حال ہے۔ لیکن اسلام کے وہ تمام اخلاقی و روحانی، ذہنی و فکری، اور تہذیبی و تمدنی اثرات، جن کی بدولت پچھلی تیرہ صدیوں میں ہر قسم کے مخالف حالات میں اسلام زندہ رہا ہے، اس مدرسۂ فکر کی پشت پر موجود ہیں۔ خود اس ملک کے اندر گذشتہ تین صدیوں سے تجدید و احیاءِ اسلام کی جو تحریکیں پے درپے اٹھتی رہی ہیں وہ سب اپنے طاقت ور اثرات کے ساتھ اس مدرسۂ فکر کی بنیاد مضبوط کر رہی ہیں۔ قوم کے متوسط اور اہلِ دماغ طبقے کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ قوم کے عوام اپنی جہالت و بے شعوری کے باوجود اس کے نصب العین سے متفق اور اس کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس پورے مدرسۂ فکر میں یہ جذبہ مشترک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی اس رُخ پر نہ جائے جدھر اسلام سے انحراف اور اسلام میں تحریف کرنے والے لوگ اسے لے جانا چاہتے ہیں، بلکہ اس کی سمتِ سفر خالص اسلام کی طرف موڑ دی جائے۔

جماعت اسلامی اسی دوسرے مدرسۂ فکر کی ایک شاخ ہے۔ اس کی دعوت کی تفصیلات اور اس کے طریقِ کار سے، یا اس کے کارکنوں سے اس زمرے کے لوگوں کو تھوڑے یا بہت اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہیں، لیکن اس کا مقام ہے اسی زمرہ میں۔ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دل کی آواز ہے جو اس ملک میں اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ اس مجموعی کوشش کا ایک جُزء ہے جو یہاں تجدیدِ اسلام کے لئے ہو رہی ہے۔ وہ کوئی درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں اسے ایک پھونک مار کر اڑا دیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی شاخ ہے جو اپنے تنے کے ساتھ وابستہ ہے اور زمین میں اپنی گہری اتری ہوئی

جڑوں کے ذریعہ سے غذا اور نشوونما پا رہی ہے۔ اس طرح کی ایک تحریک کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کے دو چار یا دس پانچ یا سب کارکنوں کو قید کر کے اس کا خاتمہ کیا جا سکے گا محض ایک خام خیالی ہے۔

عموماً اصحابِ اقتدار اپنی مرضی کے خلاف کسی تحریک کو بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف جبر کے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک طرح کا جُوا ہے جو یہ لوگ کھیلتے ہیں۔ جبر لازماً ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں کیا کرتا کہ آپ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے اسے استعمال کر بیٹھیں اور خود بخود آپ کا مطلوب نتیجہ برآمد ہو جائے اس سے تو تین مختلف طریقے برآمد ہونے کے یکساں امکانات ہیں۔ ایک ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے کارفرما اور کارکن دب جائیں یا بک جائیں۔ حکومت کے قمار باز اسی نتیجہ کی امید پر یہ بازی کھیلتے ہیں۔ دوسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ جابرانہ مزاحمت سے تحریک اور زیادہ زور پکڑ جائے اور آزمائش کی بھٹی اس کے کارکنوں کی قابلیتوں کو اور زیادہ نکھار دے۔ اسی امید پر ایک تحریک جبر کا خیر مقدم کرتی ہے اور بسا اوقات اس کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ تیسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک غلط راستے پر پڑ جائے، اس کے لیڈر اور کارکن اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھیں، یا ذمہ دار لیڈروں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک سر پھرے لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے، یا آئینی و جمہوری طرز کی جدوجہد کا راستہ بند پا کر وہ خفیہ تحریکوں کا راستہ اختیار کرے۔ یہ نتیجہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہے، نہ حکومت کے لئے، نہ ملک کے لئے، نہ خود تحریک کے لئے۔ دنیا میں بارہا جبر کے استعمال سے یہ نتیجہ رونما ہو چکا ہے۔ اس کی بدولت اچھی اچھی مفید تحریکیں بجز نقصان دہ بن گئی ہیں۔ اس نے ملکوں اور قوموں کی قسمتیں بگاڑ دی ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے سامنے روس موجود ہے جہاں زاروں کے جبر نے اصلاح کے جمہوری و آئینی طریقوں کا راستہ روک کر اصلاح طلب لوگوں کو خفیہ تحریکات کے راستے پر ڈال دیا اور اس کی بدولت پوری قوم کا مزاج ایسا بگڑ گیا کہ آج ساری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ حکومتیں اس امید پر جبر کے ہتھیار استعمال کرتی ہیں کہ یہ نتیجہ رونما نہ ہوگا۔ مگر اس کے رونما نہ ہو سکنے کی ضمانت کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

الحمد للہ کہ ہم اپنے معاملہ میں پہلے نتیجہ کا کوئی خوف نہیں رکھتے، اور خدا کے فضل سے دوسرے نتیجے کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن تیسرے نتیجے کا امکان، چاہے وہ کتنا ہی بعید ہو، ایک قابلِ حذر چیز ہے۔ اس وجہ سے میں نے

اپنی گرفتاری سے پہلے بھی یہ کہا تھا اور اب اظہارِ خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر کہتا ہوں کہ حکومت کو اس قماربازی سے باز رہنا چاہیے اور سیدھی طرح کام کرنیوالوں کے ساتھ سیدھی طرح ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ ملک کی اور خود حکومت کی اپنی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ یہاں ہر خیال کے لوگوں کیلئے رائے عام سے اپیل کرنے کا موقع کھلا رہے اور صرف رائے عام کی تبدیلی نظامِ حکومت کی تبدیلی کیلئے کافی ہو۔ بخلاف اس کے ایسے حالات پیدا کر دینا جن میں ایک مدرسۂ فکر غالب آ کر دوسرے مدارسِ فکر کا گلا گھونٹے اور نظامِ حکومت کی تبدیلی کیلئے رائے عام کو تیار کرنے کے بجائے دوسرے طریقوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے کبھی کسی ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوا ہے اور ہمارے اس ملک کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے حق میں بھی کانٹے بوتے ہیں اور خود اپنے حق میں بھی۔ ہم نے اب تک جو کام کیا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ سراسر آئینی ہے، پُرامن ہے اور علانیہ ہے۔ جو اصلاح ہمارے پیش نظر ہے اس کیلئے ہم نے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہ اختیار کیا ہے نہ آئندہ کریں گے کہ اپنے خیالات عوام الناس کے سامنے پیش کریں اور جو لوگ ہمارے ہم خیال بن جائیں اُن کو منظم کریں۔ ملک کے نظامِ زندگی میں تغیر پیدا کرنے کی صحیح صورت ہمارے نزدیک صرف یہی ہے اسی کی کوشش ہم کرتے رہے ہیں اور آگے کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں خواہ وہ برسرِ اقتدار ہوں یا نہ ہوں، ان کیلئے سیدھا اور صاف طریق کار یہ ہے کہ وہ دلائل سے ہمارا مقابلہ کریں اور جس طرح رائے عام سے ہم اپیل کر رہے ہیں وہ بھی کریں۔ ہم اس کیلئے تیار ہیں اور انہیں بھی اس کیلئے تیار ہونا چاہیے کہ باشندگانِ ملک کی اکثریت اس کھلے مقابلے میں جس مدرسۂ فکر کو پسند کرے وہ زمامِ کار پر قابض ہو اور دوسرے مدارسِ فکر عوام کی پسندیدگی حاصل کرنے کیلئے کوشش کرتے رہیں۔ اس سیدھے طریقے کو چھوڑ کر جو لوگ دوسروں کا راستہ روکنے کیلئے جبر و ظلم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور حکومت کے وسائل و ذرائع اور اختیارات اس غرض کیلئے استعمال کرتے ہیں کہ رائے عام پر ان کا دائمی قبضہ قائم رہے اور دوسروں کو اسے ہموار کرنے کا موقع مل ہی نہ سکے، وہ نادان اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ ان کا یہ طریقہ نہ صرف حکمت و مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ دیانت و امانت کے خلاف بھی ہے، کیونکہ پبلک نے حکومت کے اختیارات اس کام کے لئے ان کے حوالہ نہیں کئے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ طریقہ اخلاقی بزدلی اور ذہنی کمزوری کی کھلی علامت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے دلائل اور عملی کام کے زور سے رائے عام کو جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے اوچھے ہتھیاروں سے کام لے رہے ہیں۔

جماعت اسلامی نے ہماری گرفتاری کے بعد اور ہماری قید کے دوران میں جو رویہ اختیار کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جماعت کا مزاج اب پختہ ہو چکا ہے اور اس کے کارکنوں میں بالعموم وہ اخلاقی و ذہنی اوصاف پیدا ہو چکے ہیں جو اس کام کیلئے مطلوب ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی اشتعال اور بغیر کسی بزدلی اور مرعوبیت کے اپنا کام اسی طرح جاری رکھا جس طرح وہ پہلے سے کر رہے تھے، بلکہ اپنے مقصد کے لئے ان کی جدوجہد پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ یہ ہمارے اصلی طریق کار کے عین مطابق تھا اور حکومت کی زیادتی کا صحیح جواب بھی یہی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ رہنماؤں کی گرفتاری جماعتوں پر نہایت برا اثر ڈالتی ہے۔ کسی کے کارکنوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کسی کے کارکن مشتعل ہو کر غلط کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ کسی کے کارکن اپنا اصل کام چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کو چھڑانے میں ساری قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مقصد کے بجائے اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لئے حکومت نے ان کے رہنماؤں کو گرفتار کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت اسلامی اس قسم کے تمام برے اثرات سے محفوظ رہی، بلکہ نقصان اٹھانے کے بجائے اس نے اپنے رہنماؤں کی قید سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے سینکڑوں کارکن پہلے سے زیادہ سرگرم اور مستعد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ہماری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر محسوس کیا اور اسے سنبھالا۔ انہوں نے جماعت کی دعوت کو ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے اندرون ملک کے دیہات تک کو اپنے مدعا سے روشناس کرا دیا۔ انہوں نے ہماری رہائی کے لئے بھی اگر کوئی کوشش کی تو اس طرح کی کہ ساتھ ساتھ ہماری دعوت کی اشاعت بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس آزمائش کے مرحلے سے جماعت پوری طرح کامیاب ہو کر نکلی ہے۔ اس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور رفقاء جماعت کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں۔

چند کلمات اس رسالہ کے متعلق بھی مجھے عرض کرنے ہیں۔

میری مصروفیتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور قوت کار کم ہو رہی ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ میرے لئے زیادہ دیر تک اس رسالے کو تنہا چلانا مشکل ہے۔ تمنا تھی کہ میرے نوجوان رفیقوں میں سے کوئی اس بوجھ کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اب جیل سے باہر آ کر معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں نعیم صاحب نے بہت خوبی کے ساتھ میری جانشینی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ سہارا مل جانے کے بعد میرے کندھے اتنے ہوتے ہوئے کہ پھر اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں

(بقیہ بر صفحہ ۲۹۲)